فہم قرآن مجید سے متعلق چند اہم قوانین

مرتبہ : علامہ سید محمد حسین نیلوی

(۱) قرآن مجید کا قاعدہ اکثریہ ہے کہ سورۃ کے شروع میں توطیہ تمہید ہوتی ہے، اس کے بعد صراحتہً یا ضمناً مدعا کا بیان ہوتا ہے۔ پھر لف ونشر مرتب یا غیر مرتب کے طور پر ان مضامین کا اعادہ ہوتا ہے۔ یا قصص کو ان پر متفرع کیا جاتا ہے، یا ثمرات ونتائج کو اسی طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

(۲) قرآن مجید میں صرف دو اعلیٰ مرتبوں کا بیان ہوتا ہے۔ (۱) کفر کامل (۲) ایمان کامل، اور باقیوں کا حال مقایسہ پر چھوڑا جاتا ہے۔ اسی واسطے جس جگہ مومن کا ذکر آتا ہے وہاں جَنّٰتٌ تَجْرِیْ وغیرہ کی عبارت لائی جاتی ہے اور جہاں کافر کا ذکر آتا ہے تو وہاں جہنم اور خالدون وغیرہ کی عبارت لائی جاتی ہے۔ جیسے سورہ نساء میں بیان احکام کے بعد فرمایا : خَالِدًا فِیْهَآ اَبَدًا تو یہاں درجہ کامل ہی مراد ہے۔ یعنی اگر یہ احکام نہ مانے اور ان پر ایمان نہ لائے اور ان کے خلاف کو حلال جانے تو وہ ''خالدٌ فی النّار'' ہوگا۔ کیونکہ یہ مرتبہ کفر کا ہے۔

(۳) جہاں عذاب سے تخویف کی جائے تو دفع عذاب کے لئے دو امر بتاتے ہیں :۔

(i) احسان کرنے کا حکم

(ii) ظلم نہ کرنے کا حکم۔

(۴) جہاں یہ آتا ہے کہ دنیا سے دھوکہ نہ کھاؤ، وہاں تین امور بیان ہوتے ہیں :۔

(i) دنیا قلیل وحقیر ہے

(ii) دنیا میں مجرمین کو عذاب ملتا ہے

(iii) آخرت میں بھی مجرمین کو عذاب ملے گا۔

(۵) جو چیز اہم ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ خود بیان فرما دیتے ہیں اور باقی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باذن اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں اور اُس سے مراد شرائع واحکام ہیں۔ اور تفسیر ابو السعود میں ہے کہ قرآن مجید میں بعض احکام کی تصریح کی گئی ہے اور بعض احکام حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔

(۶) جو مسئلہ سباق سے معلوم ہو سکے اس کو اشارۃً ذکر کیا جاتا ہے اور جو مسئلہ سباق سے معلوم نہ ہو سکے اس کو صراحۃً ذکر کیا جاتا ہے تاکہ دونوں مسئلے مختصر عبارت کے ساتھ ادا ہو جائیں۔ اسی قانون کی بنا پر قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ'' ہے کیونکہ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى کا اصل جواب تو یہ ہے کہ اگرچہ یتامیٰ کو کچھ نہ دو تو گرفت نہیں، لیکن چونکہ یہ جواب سیاق و عبارت سے معلوم ہو جاتا تھا، اس لئے اسے ذکر نہیں کیا گیا اور صرف قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ' پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ اور یہی قاعدہ اکثر مقامات میں جاری ہوتا رہتا ہے۔

(۷) اگر شروع کلام میں حصر آجائے تو اس کے بعد بھی حصر مراد ہوتا ہے اگرچہ کلمہ حصر کا نہ ہو' جیسے هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ میں حصر ہے، کیونکہ خبر بھی معرفہ ہے۔ اب اس کے بعد تمام آیت میں حصر کا معنی ملحوظ ہوگا۔

(۸) قرآن مجید میں پہلے قاعدہ کا ذکر ہوتا ہے، پھر اس کے جزئیات بیان کیے جاتے ہیں' جیسے قاعدہ بتایا

عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

''غیب کی چابیاں اس کے پاس ہیں اس کے علاوہ کوئی اس سے باخبر نہیں ہے''

کے ساتھ اس قاعدہ کے جزئیات بتائے۔ نیز اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اشیاء کو بھی جانتا ہے اور ان کے احوال متغیرہ کو بھی وہی جانتا ہے۔

(۹) قرآن مجید کا قاعدہ ہے کہ دعویٰ بیان کر کے دلائل ذکر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تخویفات وبشارات اور شکویات بھی ذکر کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس دعوے کا اعادہ مع دلائل و تخویفات وبشارات اور شکویات کے فرماتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بے ربطی کلام ہے۔

(۱۰) قرآن مجید دعوے کے اثبات کے لئے تین قسم کے دلائل بیان کرتا ہے :۔

(i) دلائل عقلیہ (ii) دلائل نقلیہ (iii) دلائل وحی۔

پھر دلائل نقلیہ کی بھی کئی قسمیں ہیں :

(۱) از انبیاء (۲) از علماء (۳) از ملائکہ (۴) از جنات (۵) از طیور (۶) از کتب سماویہ سابقہ۔

(۱) دلیل نقلی (از انبیاء و علماء) کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انبیاء سابقین و علماء کے اقوال و افعال پیش کیے جاتے ہیں' جو دعوی توحید کے مؤید ہوں۔ پھر اس کی دو صورتیں ہیں : (۱) انبیاء سابقین سے یہ نقل کرنا کہ ان پر بھی وحی آتی رہی' جو ہمارے اس نبیؐ پر آتی ہے اور توحید ہی ان کا مشن تھا (۲) انبیاء سابقین کا یہ حال بتانا کہ جیسے توحید پرست وہ خود تھے، دوسرے لوگوں کو بھی توحید کی ہی تبلیغ کرتے رہے۔

(۲)۔ دلیل عقلی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ توحید کا دعویٰ ایسا ہے کہ جس کو عقل سلیم بھی تسلیم کرتی ہے پھر یہ دلیل عقلی بھی دو قسم کی ہے :۔

(۱) دلیل عقلی محض (۲) دلیل عقلی علی سبیل الاعتراف من الخصم یعنی خود کفار و مشرکین سے دوران مناظرہ توحید کا اقرار لیا جائے۔

(۳)۔ دلیل وحی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضرت رسول اللہؐ کا یہ دعویٰ اپنی طرف سے بیان کردہ نہیں ہے بلکہ حضرت محمدؐ اس دعویٰ کے اظہار و تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔

(۱۱) پہلے دعویٰ (یعنی یہ کہ ہمہ کن صرف اللہ تعالیٰ ہے) کے لیے دلائل عقلیہ زیادہ بیان ہوتے ہیں۔ اور دوسرے دعویٰ (یعنی یہ کہ ہمہ دان صرف اللہ تعالیٰ ہے) کے لیے دلائل عقلیہ کم بیان ہوتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ جب پہلا دعویٰ ثابت ہو گیا تو دوسرا دعویٰ خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

(۱۲) شفیق واعظین کی طرح قرآن مجید کا طریقہ ہے کہ اپنی بات کو بار بار دہراتا ہے اور اس پر تنویر لاتا ہے۔

(۱۳) قرآن مجید کی کسی سورت میں ابتدا سے آخر تک بیان ہوتا ہے اور کسی سورت میں آخر سے ابتدا تک بیان ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ انعام میں پہلے تخلیق کا ذکر ہے، پھر تصرف کا ذکر ہے کہ متصرف صرف اللہ تعالیٰ ہے اور تخت شاہی پر وہ خود ہی قائم ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کیا۔ اور پھر رحمت کا ذکر ہے۔ اور سورہ حشر میں پہلے رحمت کا ذکر ہے، پھر تصرف کا اور پھر تخلیق کا ذکر ہے۔

(۱۴) قرآن مجید میں تمام قصص عبرت کے لیے بیان کیے گئے ہیں، محض کہانیاں نہیں ہیں

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرٰى.

(۱۵) قرآن مجید میں یہ بات بہت دفعہ آئی ہے کہ جب ایک طرف ایک بات ذکر کی جاتی ہے تو دوسری طرف دوسری بات کا کچھ حصہ ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ دونوں کو دیکھ کر ایک پورا مضمون سمجھا جا سکے۔ مثلاً سورہ سبا میں ایک طرف الحمد اللہ فرمایا اور دوسری طرف وھو الحکیم الخبیر سے دوسرے جملہ (وله الحمد فی الاخرة) کی علت بیان کی، تو معنی یہ ہوا کہ سب کچھ کرنے والا وہی ہے، پس حمد بھی اسی ذات کے لئے ثابت ہے جو کہ دنیا میں دینے لینے والا ہے اور وله الحمد فی الاخرة یعنی آخرت میں دینے والا بھی وہی ہے. اور لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اسی کے قبضے میں ہیں۔ اور دنیا میں دینے والا بھی وہی ہے۔ پس اس میں معنے کے اعتبار سے ہر دو جملے مطابق ہو گئے۔

(۱۶) جس سورت کی ابتداء میں "قرآن" کا لفظ ہو تو اس سورت میں کوئی ایسا واقعہ ضرور مذکور ہو گا جو پہلی کتب سماویہ میں بیان نہ کیا گیا ہو۔ اور جس سورت کی ابتدا میں "کتاب" کا لفظ ہو تو اس سورت میں کتب سابقہ اور انبیاء کرام علیہم السلام وغیرہم کے بیانات کا ذکر ہو گا۔ اور جس سورت کی ابتدا میں "کتاب" اور "قرآن" ہر دو لفظ ہوں تو وہاں دونوں باتیں ہوں گی۔

(۱۷) جس سورت کی ابتدا میں لفظ ''مبین'' ہو تو اس سورت میں دلائل نقلیہ کا بیان ہوگا۔ اور جس سورت کی ابتدا میں لفظ ''حکیم'' ہو تو اس سورت میں دلائل عقلیہ بیان ہوں گے۔ اور جس سورت کی ابتدا میں لفظ ''مبین'' اور ''حکیم'' ہر دو لفظ ہوں تو اس سورت میں دلائل عقلیہ ونقلیہ ہر دو بیان ہوں گے۔

(۱۸) قرآن مجید عقائد کی اولین کتاب ہے۔ اس میں اصل مقصود توحید ہے، جس کے ساتھ ایمان بالرسالۃ لازم ہے اور اس کے لئے جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ مؤید اور سنام اسلام ہیں، اور اس کے علاوہ احکام شرع بالتبع آتے ہیں۔

(۱۹) اکثر مضامین قرآن میں چار طریقے سے بیان کیے گئے ہیں:

(۱) علی سبیل اللف والنشر المرتب (۲) علی سبیل اللف والنشر الغیر المرتب (۳) علی سبیل الترقی

(۴) علی سبیل التنزل۔

(۲۰) قرآن مجید میں زیادہ زور شرک اعتقادی کی نفی پر دیا گیا ہے اور شرک عملی کی نفی صرف چند مقامات پر ہے۔

(۲۱) قرآن مجید کی پہلی پچاس سورتوں میں یعنی ختم حجرات تک اکثر توحید کا بیان ہے، اور باقی سورتوں میں اکثر قیامت کا بیان ہے۔

(۲۲) قرآن مجید میں مکی سورتوں کی آیات چھوٹی چھوٹی ہیں اور مدنی سورتوں کی آیات قدرے لمبی ہوتی ہیں۔

(۲۳) قرآن مجید کی مکی سورتوں میں منافقین کا حال ذکر نہیں اور مدنی سورتوں میں عام طور پر منافقین کا ذکر آتا ہے۔

(۲۴) مکی سورتوں میں عموماً دعوت اصلاح عقائد ہوتی ہے اور منکرین کو توحید ورسالت اور آخرت کی طرف بلانا۔ جن کا اسلوب بیان خطیبانہ ہوتا ہے اور دیگر خطبات کے دستور کے مطابق مؤثر انداز میں سوالات واستفہامات بھی زائد ہوتے ہیں۔ اس طرز خطاب سے سامعین کے دل میں مزید اشتیاق وجستجو پیدا کرنے کے علاوہ موضوع خطاب کی اہمیت جتلانا مقصود ہوتا ہے۔ کلام میں زور اور اثر پیدا کرنے، اور مخاطبین کی جلب توجہ کے لئے، اور ایسا اسلوب اور طرز بیان یونانی، انگریزی اور اردو وغیرہ زبانوں میں بھی مسلّم اور متعارف ہے۔

(۲۵) مکی سورتوں میں عقیدہ توحید کے بعد قدرۃً سب سے زیادہ زور عقیدہ آخرت پر ہی ہے۔

(۲۶) مخاطبین اول کے فہم ومذاق کی رعایت خصوصیت کے ساتھ رکھنا بلاغت کلام اور فن خطابت دونوں کے اصول اعلیٰ میں داخل ہے، اور طرز بیان قرآن حکیم کا ہے۔

(۲۷) اہل عرب کا دستور تھا کہ تاکید اور زور کے لیے قسم کھایا کرتے تھے، اور قرآن حکیم کا اسلوب بیان بھی یہی ہے۔

(۲۸) دوران خطاب مخاطبین سے سوالات کرتے جانا' عربی خطابات میں عام اور عربی اسلوب بلاغت کا اہم جزء تھا۔ اور قرآن مجید میں بھی یہی اسلوب بیان عام ہے۔

(۲۹) اہل عرب کے ادب وانشاء میں یہ طریقہ عام تھا کہ ایک ذکر میں دوسرا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا ذکر نکالتے چلے جاتے اور پھر اسی پہلے ذکر کی طرف رجوع کرتے، اب سورہ نساء کی آخری آیت کلالہ والی کو سمجھو کہ درمیان میں شبہ نمبر ۴ سے یہاں تک کتنا کچھ ذکر ہوا۔ جس کے بعد پھر شبہ نمبر ۵ کے جواب کی طرف عود فرمایا۔

(۳۰) قرآن کریم کو محض بصیرتوں' عبرتوں اور اخلاقی اسباق و نتائج سے بحث و سروکار رہتی ہے اسی لیے تاریخی و جغرافیائی تفصیلات کو اکثر نظر انداز کر دیتا ہے۔

(۳۱) قرآن کریم سیرت یا تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے کہ وہ جس شخصیت کا ذکر کرے اس کے تمام حالات کا احاطہ کرے کیونکہ یہ چیز اس کے موضوع سے خارج ہے وہ جس شخص کا ذکر کرتا ہے اس کی زندگی کے اسی پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو دوسروں کے لیے پند و موعظت اور عبرت اور نصیحت کا سبق ہو۔ اور قصے کے اس حصے کو حذف کر دیتا ہے جو اصل مسئلہ سے متعلق نہ ہو۔

(۳۲) قرآن کریم بجائے نسل، نسب و خاندان کے، مسلک و عقیدہ کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔ اسی لیے بار بار کہتا ہے کہ یہود کا کفر و انکار کسی اجتہادی غلطی پر مبنی نہیں بلکہ اس غصہ اور عناد کا نتیجہ تھا کہ نبوت خاندان بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کو کیوں مل گئی۔ یہود نبوت کو اپنا موروثی حق سمجھنے لگے تھے۔

(۳۳) عربی اسلوب بلاغت میں "قسم" ایک ادبی صنعت و فنکاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی قسمیں ذوق عرب پر بالکل گراں نہیں گزریں اور اہل لسان میں سے مخالفین نے بھی کبھی یہ اعتراض نہ کیا کہ خدا کے کلام میں یہ مخلوقات کی قسمیں کیسی؟ اردو محاورہ میں کہتے ہیں کہ میرے کارناموں پر میری تلوار گواہ ہے۔ اور عربی محاورہ میں والمہند کہتے ہیں، یعنی مجھے تلوار کی قسم ہے۔ قسم کی چار اقسام ہیں:

(۱) جس ذات کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو عالم الغیب و متصرف و مختار سمجھ کر کھائی جائے اور مقسم بہ کے متعلق یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اسے میرے حالات کی خبر ہے اور وہ مجھے نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ ایسی قسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس اعتقاد سے غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے۔

(۲) مدعا کو ثابت کرنے کے لیے مُقسم بہ کو بطور دلیل و شاہد کے پیش کیا جاتا ہے جیسے "قسم بلب میگون تو و زلف شبگون تو کہ محبوب دلربائی" یعنی تیرے لب اور زلفیں اس بات کی شاہد ہیں کہ تو دلربا ہے۔ اس میں

سرخ ہونٹوں اور سیاہ بالوں کو اس کے محبوب ہونے پر بطور شاہد پیش کیا گیا ہے۔ یہ قسم لغیر اللہ بقول امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ جائز ہے۔ اور قرآن کریم میں اس طرح کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، جیسے والعصر ان الانسان لفی خسر۔ یعنی زمانہ گواہ ہے کہ آدمی گھاٹے میں ہے، ایسے ہی ن والقلم۔ اسی طرح دوسری کئی سورتوں میں فقرے آئے ہیں۔

(۳) قسم دُعائی جگہ بھی استعمال ہوتی ہے۔ یعنی اس قسم سے دعا دینا مقصود ہوتا ہے۔ اور وہ موقع ایسا ہوتا ہے کہ وہاں بددعا مناسب نہیں۔ جیسے کوئی اپنے محبوب کو کہے کہ اللہ کرے تو زندہ رہے۔ اور یہ کہنا مناسب نہیں کہ اگر میں ناحق کہوں تو اللہ تعالیٰ تجھے مجھ سے چھین لے اور تجھے مار دے۔ جیسے عربی لعمرک انہم سکر تہم یعمہون کہتے ہیں۔ یعنی تیری زندگی کی قسم۔ مطلب یہ کہ اللہ کرے کہ تیری زندگی دراز ہو۔ اردو میں کہتے ہیں تیرے سر کی قسم۔ اس سے بھی یہی مراد ہوتی ہے۔ پنجابی میں بقول عمّی مکرمی مولانا محمد شاہ جہلمی رحمہ اللہ تعالیٰ "شالا جیویں" کہتے ہیں۔ اور اس قسم کی قسم کھانا بھی جائز ہے اس میں شرک نہیں ہے یہ محض دعائیہ قسم ہے۔

(۴) قسم بددعائی جگہ بھی استعمال ہوتی ہے، جیسے عدمت بنیتی ان لم تروہا تثیر النقع من کنفی کداء (دیوان حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ) یعنی اے مکہ والو! کداء پہاڑی کی طرف سے اگر ہم تم پر چڑھائی کریں گے اور اسی راستے سے اگر ہمارے گھوڑے تم کو فتح کریں گے اگر تم ان گھوڑوں کو کداء پہاڑی کے دونوں طرف گرد وغبار اڑاتے نہ دیکھو تو میں اپنی بیٹی کا غم دیکھوں۔ یعنی اگر میں جھوٹ بولوں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ نعمت چھین لے۔ اس لیے فتح مکہ کے موقع پر نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ حسانؓ کی قسم پوری کرنے کے لیے کداء میں سے لشکر گزاریں اور پھر مکہ میں داخل ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ قسم بھی جائز ہے۔

(۳۴) قرآن کریم بیان واقعات اور ذکر حکایات کے ضمن میں بھی مسائل کی توضیح اور عقائد کی تصحیح کرتا جاتا ہے۔

(۳۵) جزئیات سے کلیات اور فروع سے اصول تک پہنچ جانا قرآن کا عام طرز بیان ہے۔

(۳۶) زور و جوش کے موقع پر فقروں کی تکرار جیسے کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون۔ عربی حسن خطابت اور اسلوب بلاغت کا اہمیت خصوصی کے اظہار کے لیے ایک خاص نمونہ ہے۔ جیسے اردو محاورہ میں کہتے ہیں: "ابھی یہ دیکھیں گے اور پھر دیکھیں گے۔"

(۳۷) خطبات کو اور سورت کو استفہامی فقرہ سے شروع کرنا، مخاطب کو سوال کرکے توجہ دلانا عین بلاغت اور عربی خطابت کے اسلوب کے مطابق ہے۔ اور اس کو حسن انشاء و خطابت کا ایک بہترین نمونہ سمجھا گیا ہے، جیسے ایک قصیدہ میں ہے

ءمنْ تذكُر حبْرانَ بابْی سلم

(۳۸) جزئی حکم کے بعد کلی تنبیہ قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ہے۔

(۳۹) قرآن مجید میں اصل قاعدہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عبارت میں کسی لفظ کو مقدر ماننے اور فرض کر لینے سے احتراز کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اصل عدم تقدیر ہے۔

(۴۰) سیاق عبارت سے جو مسئلہ نکلے وہ قرآن کریم میں اکثر اشارۃ بیان کیا جاتا ہے اور جو مسئلہ سیاق سے معلوم نہ ہو وہ صراحۃ مذکور ہوتا ہے تاکہ دونوں مسئلے مذکور ہو جائیں۔

(۴۱) قرآن مجید میں گزشتہ واقعات کے بیان میں جہاں امر کا صیغہ استعمال ہوگا، وہاں پر اس سے پہلے قال یا قلنا مقدر ہوگا۔ کذا فی الرضی جیسے وانزلنا علیکم المنّ والسلوی (قلنا) کلوا من طیبات ما رزقنکم۔ اسی طرح

واذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور (قلنا) خذوا ما اتینا کم بقوۃ (۶۳:۲)

(۴۲) قرآن مجید کے اکثر مقامات میں امر کا صیغہ بول کر امر مدامی مراد لیا جاتا ہے، جیسے:

اقیمو الصلوۃ واتوا الزکوۃ

اتل ما اوحی الیک من الکتب واقم الصلوۃ۔

(۴۳) ایک ہی کلام میں قالوا کئی بار آجاتا ہے، تو ایک قالوا کی ضمیر سے ایک بعض مراد ہوگا اور دوسرے قالوا کی ضمیر سے دوسرا بعض مراد ہوگا۔ جیسے

قال قائل منہم کم لبثتم قالوا لبثنا یوما او بعض یوم قالوا ربکم اعلم بما لبثتم۔ (۱۸:۱۹)

(۴۴) قرآن مجید میں ایک مطلب کی آیات تاکید کے لیے بار بار لائی جاتی ہیں، جیسے حج کے خطبوں میں تاکید اور یاد دہانی کے لیے بار بار مناسک حج بیان کیے جاتے ہیں۔

(۴۵) حوامیم، حج کے خطبوں کی طرح ہیں، اور وہ اس طرح کہ پہلے خطبے میں اس دن کے احکام بھی بیان ہوتے ہیں اور آئندہ دو دنوں کے بھی۔ اور دوسرے خطبے میں تیسرے دن کے احکام بھی بیان کیے جاتے ہیں اور آئندہ دو دنوں کے احکام بھی بیان ہوتے ہیں اور تیسرے خطبے میں اس خطبہ والے دن کے احکام بھی بیان ہوتے ہیں اور تیسرے خطبے میں اس والے دن کے احکام بھی بیان ہوتے ہیں اور دیگر احکام بھی۔ لیکن اپنے اپنے موقع پر اس کی زیادہ تفصیل بیان کی جاتی ہے اور دوسرے موقع پر اجمال ہوتا ہے۔

(۴۶) اصول کا قاعدہ مقررہ ہے کہ عموم لفظ کو دیکھا جاتا ہے، خصوص سبب کا اعتبار نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرطبی، معالین، جلالین، نہایۃ المحتاج، بدایۃ اخیرین اور البحر المحیط و تفسیر کبیر وغیرہ کتب میں ہے:

العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب۔

(۴۷) حروف مقطعات جو بعض سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں، فرقہ حشویہ کے نزدیک وہ بے معنی ہیں اور یہ صریح غلط ہے. فرقہ مرجیئہ نے کہا کہ ان کے معنی ظاہر کے خلاف مراد ہیں اور یہ بھی غلط ہے کیونکہ یہ بات باقی قرآن میں بھی کہی جاسکتی ہے، اس طرح جو چاہے وہ اپنے مطلب کی تفسیر کرے. اور ہم اہل سنت کہتے ہیں کہ ان کی مراد ہمیں تحقیق سے معلوم نہیں یہ متشابہات سے ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے کہ جو مراد اللہ کی ہے وہی برحق ہے.

(۴۸) شان نزول کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید میں جو حکم ہے اس کے مطابق کچھ قصے ہو گئے اور کچھ آئندہ ہوں گے. اور مفسرین کی عبارتوں میں جو فَنَزَلَتْ کا لفظ آتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے. اور ہمیشہ اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ واقعہ پہلے ہو چکا پھر اس کے بعد آیت نازل ہوئی. کیونکہ کئی واقعات نزولِ آیات کے بعد واقع ہوئے ہیں. اسی لیے کہا گیا ہے:

أضرالاشياء فی فهم القرآن شان النزول الاان لايكون منه بد. (بلغته الحيران ص ۱۰۳)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی تفسیر کبیر سے نقل کیا ہے کہ "شان نزول" کی روایات سے یہ مطلب نہیں ہے کہ آیت کا انطباق صرف اسی خاص شخص تک محدود ہے بلکہ جہاں کہیں بھی وہ صفات پائی جائیں گی وہاں وہ آیت بھی چسپاں ہوگی. (تفسیر ماجدی ص ۸۱) پھر ہمارے پیرومرشد رحمہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید شان نزول کا محتاج نہیں ہے اور تفسیر قرآن میں جو شانِ نزول کے ساتھ بنی اسرائیل وغیرہ کے قصے لکھ دیتے ہیں وہ معتبر نہیں ہیں کذا قال الشاه ولی الله صاحب رحمہ اللہ تعالی و قیل اضرالاشیاء فی تفسیر القرآن شان النزول. (بلغۃ الحیران ص ۴) نیز حضرت علامہ زرکشی رحمہ اللہ تعالے نے البرہان ص ۳۴ ج ۱ میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر وجہ مناسبت موقوف ہو سبب نزول پر، تو سبب نزول مقدم ہوتا ہے ورنہ وجہ مناسبت مقدم ہوگی. اور ج ۱ ص ۲۶ میں تحریر فرماتے ہیں کہ سبب نزول میں زمانہ شرط ہے، اور مناسبت میں زمانہ شرط نہیں ہے. نیز ہمارے پیرو مرشد نے جو فرمایا ہے الاان يكون منه بد. تو اس کی مثال سورۃ مائدہ کی آیات ۱۰۶ تا ۱۰۸، اور سورۃ حجر کی آیات ۹۰ و ۹۵، کہ جن کا مطلب شان نزول کے معلوم کیے بغیر حل نہیں ہو سکتا.

☆ ☆ ☆

جان لو کہ! کسی کو قرآن کی تعلیمات کے بعد کسی اور لائحہ عمل کی احتیاج نہیں رہی اور نہ کوئی قرآن سے کچھ سیکھنے سے پہلے اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔

(حضرت علیؓ)